ADVANCE SOCIAL SCIENCE ARCHIVE JOURNAL
Available Online: https://assajournal.com
Vol. 03 No. 02. April-June 2025.Page#.435-447
Print ISSN: 3006-2497 Online ISSN: 3006-2500
Platform & Workflow by: Open Journal Systems

The Islamic Approaches toward Purification of soul :Analytical Study of Allama Iqbal Thoughts

تہذیب نفس کا اسلامی منہج:علامہ اقبال کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ

Dr Muhammad Shah Faisal
IRI POSTDOCTORAL FELLOWSHIPS 2024/25
International Islamic University Islamabad
Assistant professor Islamic Studies Department
Alhamd Islamic University Islamabad
dr.shah.faisal@aiu.edu.pk
Hafiz Muhammad Nadeem
Lecture Islamic Studies department
Alhamd Islamic University Islamaba
Dr Hafiz Muhammad Naveed
Lecture Islamic Studies department
Federal Urdu University Islamabad

Abstract
In this article, the Islamic process of Purification of soul is analytically described in the light of Allama Iqbal's thoughts. Soul-Purification is another name for fulfillment person's legitimate wishes, purposes, and mottoes. While different persons have different goals or objectives but same type of methods and principles for achieving it . Under the light of Allama Iqbal's thoughts, the techniques and Guideline of soul-Purification cannot be defined as complete, fixed, and associated form. However, if one pays enough and In-depth attention to his philosophical thoughts and practical illustration, the approach to soul-purification will become transparent in some places and inherent in others. Iqbal's defined approach to soul-Purification is a apparent of human inherent and a reflection.Under the light of Iqbal's thoughts, this Article explain three way of selfhood which include complaince, soul-restraint, and divine closeness, including these Soul descipline, way of moderation,treatment of Inner-thoughts, the principle of self-safety, well defined goals, firm belief, action and consistency, constant objective visualization rule, "furthermore" remarkable way of soul-care like striving and endeavor are part of this Article.

Key words: Quran, Sunnah, Shari'ah, Soul, Purification of Soul, Iqbal, Allama Iqbal.

تمہید:

اس آرٹیکل میں تہذیبِ نفس کے اسلامی منہج کو علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ تہذیبِ نفس کسی انسان کی جائز خواہشات، مقاصد اور نصب العین کی تکمیل کا دوسرا نام ہے۔ مختلف انسانوں کے مختلف مقاصد ہوتے ہیں تاہم ان مقاصد کے حصول کے لیے طرق اور اصول یکساں ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں تہذیبِ نفس کے طرق اور اصولوں کو کوئی مکمل، مستقل اور مربوط شکل تو نہیں دی جا سکتی تاہم اگر ان کے فلسفیانہ افکار اور ان کی عملی توضیح کی طرف کافی اور گہری توجہ دی جائے تو

کہیں تہذیبِ نفس کا منہج بالکل واضح اور کہیں مضمر دکھائی دے گا۔ اقبال کا بیان کردہ تہذیبِ نفس کا منہج انسانی فطرت کا مظہر اور آئینہ دار ہے۔ اس آرٹیکل میں افکارِ اقبال کی روشنی میں خودی کے تین مراحل جن میں اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی شامل ہیں انہیں اور نفس کے حق میں افراط و تفریط اور راہِ اعتدال، خواطرِ نفس کا علاج، حفاظتِ نفس کا اصول، متعین نصب العین، یقینِ محکم، عمل واستقلال اور مسلسل تصورِ مقصد کے اصول نیز نفس کی نگہداشت کے طُرق جن میں مشارطہ اور مجاہدہ قابلِ ذکر ہیں بیان کیے گئے ہیں۔

فکرِ اقبال اور تہذیبِ نفس:

اقبال تہذیبِ نفس کی اہمیت کے متعلق یوں رقمطراز ہیں کہ: ہستی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج طے کرنا اور زیادہ سے زیادہ تجلی حاصل کرنا انسان کا نصبُ العین ہے۔[1] اسی طرح اپنے خطبے میں کہتے ہیں کہ: قرآن، نفس اور دنیا کو علم کے وسیلے خیال کرتا ہے۔ خدا اپنی نشانیاں داخلی اور خارجی تجربے میں ظاہر کرتا ہے اور یہ انسان کا فرض ہے کہ وہ تجربے کے تمام پہلوؤں کی علم عطا کرنے والی صلاحیت کا اندازہ کرے۔[2] تہذیبِ نفس کو اقبال نے پیامِ مشرق میں اغوائے آدم کے تحت یوں بیان کیا ہے:

زشت و نکو زادۂ وہم خداوندِ تست　　　لذّتِ کردار گیر، گام بنہ، جوے کام[3]

نیکی و بدی کا تصور تیرے وہم کے خدا کا پیدا کردہ ہے۔ کردار کی لذت حاصل کر، راستہ پر قدم رکھ اور مقصد تلاش کر۔[4]

یعنی انسان کو چاہیے کہ نیکی اور بدی کا خیال چھوڑ دے، کیوں کہ یہ تصور وہم کو پیدا کرنے والے نے ہی دیا ہے۔ انسان اپنے عمل کا مزہ لے، اس پر چلے اور کامیابی حاصل کرے۔ نفس کے سبب نیکی اور بدی میں نہیں پڑنا چاہیے بلکہ کردار مضبوط کرنا چاہیے تاکہ بندہ گمراہ نہ ہو۔ اقبال نے پیامِ مشرق کے دیباچہ میں قرآنی آیت کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ:

اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالہ میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کی ضمیر میں متشکل نہ ہو۔[5]

معلوم ہوا کہ اگر انسان اپنی ہستی پر غور کرے، اس کے اندرونی اور بیرونی تجربات پر نظر رکھے، روحانیت کی طرف متوجہ ہو جائے اور نفس کی سرکشی سے خود کو بچائے تو اس صورت میں گویا وہ اپنے نصب العین کو حاصل کرے گا جو نیابتِ الٰہی ہے اور نیابتِ الٰہی کا اہل وہ شخص ہے جو مہذب نفس رکھتا ہے۔ مزید بر آں کہ زندگی میں انقلاب اسی صورت میں ممکن ہے جب اندرونی گہرائیوں میں انقلاب برپا ہو، یعنی انسان نفس کے حیلوں اور فریب کاریوں سے بچ کر اپنی اصلاح کر لے تو تہذیبِ نفس ہو جائے گی اور انسان صرف انسان نہیں بلکہ انسانِ کامل بن جائے گا جو خلیفۃ اللہ ہو۔ اقبال کے ہاں نیابتِ الٰہی خودی کی تربیت کے بغیر ممکن نہیں اور خودی کی تربیت و تکمیل کے دو مراحل ہیں جن کے ذریعے انسان نیابتِ الٰہی کے مقام پر فائض ہوتا ہے:

اطاعت:

اقبال کے ہاں تہذیبِ نفس کی بنیاد اطاعت و بندگی ہے۔ اسی سے خودی روشن، مستحکم اور حق شناس ہوتی ہے۔ اگر اطاعت کی بجائے سرکشی اختیار کی جائے تو یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے انسان نے خود کو مقامِ انسانیت کی بلندی سے پستی اور زوال کی گہرائیوں میں گرایا ہو۔ اسی لیے اقبال کے ہاں اطاعت پہلے بیان کی گئی ہے تاکہ پہلے بندہ مطیع بن جائے اور سرکشی سے باز آجائے۔ اقبال اسرارِ خودی میں رقمطراز ہیں کہ:

در اطاعت کوش اے غفلت شعار　　　می شود از جبر پیدا اختیار
باطنِ ہر شے ز آئینے قوی　　　تو چرا غافل ازیں ساماں روی
شکوہ سنجِ سختیٔ آئیں مشو　　　از حدودِ مصطفیٰ ﷺ بیروں مرو[6]

---

[1] اقبال، **فلسفۂ عجم**، ترجمہ: میر حسن الدین (جہلم: بک کارنر شوروم، 2013ء)، 134۔
[2] محمد اقبال، **اسلامی فکر کی نئی تشکیل**، ترجمہ: شہزاد احمد (لاہور: مکتبہ خلیل، جنوری 2014ء)، 156۔
[3] علامہ محمد اقبال، **کلیاتِ اقبال فارسی، اسرارِ خودی** (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، 1972ء)، 86، 256۔
[4] محمد وسیم اکرم القادری، یوسف مثالی، **شرح کلیاتِ اقبال** (فارسی و اردو) (لاہور: مشتاق بک کارنر، 2018ء)، **نوٹ: اقبال کے فارسی کلام کا ترجمہ اسی کتاب سے مذکور ہے۔**
[5] اقبال، **کلیات اقبال فارسی، دیباچہ پیامِ مشرق**، 12، 182۔
[6] اقبال، **کلیات اقبال فارسی، اسرار خودی**، 41، 41۔

اے غافل شعار! اطاعت میں پوری سعی کر۔ جبر سے اختیار حاصل ہوتا ہے۔ ہر چیز کا باطن آئین سے ہی قوت حاصل کرتا ہے۔ تُو پھر اس عظیم سامان سے کیوں غافل ہے۔ آئین کی سختی کا شکوہ مت کر۔ مصطفیٰ کریم ﷺ کی (شریعت کی) حدوں سے باہر نہ جا۔

اقبال کہتے ہیں کہ انسان کو فرمانبر داری اور حکم کی تعمیل میں اپنی پوری کوشش اور ساری صلاحیتیں صرف کرنی چاہئیں۔ اس سے انسان جبر سے اختیار حاصل کرنے کا اہل ہو گا۔ یعنی اپنے کسی کام میں سستی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اپنے اوپر جبر بھی کرنا پڑے تو کرے اور کام کو کسی اور وقت پر نہ ٹالے کیوں کہ عمل ہی انسان کے حق میں بہتریاں لانے والا ہوتا ہے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ آئین و دستور قدرت نے ہر شے کے لیے اُس کے ظرف کے مطابق وضع کیا ہے۔ اسی سے ہر چیز کا باطن طاقت حاصل کرتا ہے۔ معلوم نہیں کہ انسان اس عظمت والے سامان سے کیوں غافل ہے یعنی انسان اس آئین سے ناواقف ہے جو اس کے لیے بنایا گیا ہے۔ اب آئین سے کیا مراد ہے تو اس کے متعلق لکھتے ہیں: یعنی اگر انسان آئین کی سختی کا شکوہ کرے تو یہ بیکار ہے کیوں کہ قدرت کا قانون عام انسانوں کی فلاح و بہبود اور تہذیب ہی کے لیے تو ہے لہذا اگر انسان شریعت محمدی پر عمل پیرا ہو جائے، آپ ﷺ کی اطاعت کو لازم کرلے تو اس کی روح فرحت بخش بن جائے گی۔

ضبطِ نفس:

ضبطِ نفس کا مرحلہ اطاعتِ قانونِ الٰہی اور نبی اکرم ﷺ کی پیروی کے بعد آتا ہے۔ نفسِ امارہ انسان کو خیر سے دور کرنے میں سرگرداں رہتا ہے اور سرکشی کی جانب راغب کرتا ہے۔ خودی کے مرتبۂ کمال تک پہنچنے کے لیے نفس کو مغلوب کرنا ضروری ہے۔ نفسِ انسان تو حیلہ سازی اور ہرزہ سرائی سے کام لیتا ہے جس سے نفسانی خواہشات غالب آ جاتی ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:

نفسِ تو مثلِ شتر خود پرور است	خود پرست و خود سوار و خود سر است
ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں	می شود فرماں پذیر از دیگراں
مرد شو آور زمامِ او بکف	تاشوی گوھر اگر باشی خزف[7]
روزہ بر جوع و عطش شبخون زند	خیبر تن پروری رابشکند[8]

تمہارا نفس اونٹ کی طرح خود پرور ہے۔ وہ خود پرست ہے، خود اپنا سوار آپ ہے اور خود سر ہے۔ ہر وہ آدمی جو اپنا فرمانروا نہیں ہے۔ اسے دوسروں کا فرماں بردار ہونا پڑتا ہے۔ تو مرد بن کر اونٹ کی باگ کو خود سنبھال لے۔ یوں تُو موتی بن جائے گا اگرچہ تُو ٹھیکری بھی ہوا۔ روزہ بھوک پیاس (خواہشاتِ نفسانی) پر شب خون مارتا ہے۔ یہ تن پروری کے خیبر کو توڑ دیتا ہے۔

ان اشعار میں اقبال نے تہذیب کا دوسرا مرحلہ بیان کیا ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ اے مسلمان تیرا نفس اونٹ کی طرح خود کو پالنے والا ہے۔ اپنی پوجا کرتا ہے یعنی متکبر ہے اور اپنے آپ کو بہت زیادہ چاہتا ہے۔ خود پر خود ہی سوار ہے یعنی باگ دوڑ اس کے اپنے ہاتھ میں ہے اور بہت ضدی ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ جو شخص اپنے آپ کو اپنے حکم پر چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتا پھر اُسے دوسروں کے حکم پر چلنا پڑتا ہے۔ اور یہ غلامی ہی ایک شکل ہے۔ جو کسی بھی طرح ایک آزاد مردِ مسلمان کے لیے مناسب نہیں۔ ضبطِ نفس کے لیے اپنے نفس پر ہر وقت نگران رہنا چاہیے ورنہ بندہ نفس کا غلام ہو جائے گا۔

مزید کہتے ہیں کہ نفس کی نگرانی تیری قدر و قیمت میں بے پناہ اضافہ کر دے گی۔ اپنے نفس کی باگ سنبھالنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان ضبطِ نفس کرے۔ اس کے بہکاوں میں نہ آئے بلکہ مسلسل اس کی نگرانی کرتا رہے، تا کہ یہ مہذب بن جائے۔ آخری شعر میں اقبال نے تہذیبِ نفس کے لیے روزہ تجویز کیا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث میں بھی موجود ہے۔ کیوں کہ روزہ بھوک اور پیاس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ بھوک اور پیاس سے مراد یہاں نفسانی خواہشات ہیں۔

روزہ انسان کو ناجائز خواہشات سے باز رکھنے اور اپنے آپ کو ان خواہشات کے مقابلے میں مضبوط بناتا ہے۔ انسان کی طرف یلغار کرنے والی ان گنت منفی قوتوں کے لیے ڈھال ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ تن کی پرورش کے قلعے کو توڑ دیتا ہے اور روح کی پرورش کرتا ہے۔ جب روحانیت مضبوط ہو تو بندہ نفس کے جال سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

نیابتِ الٰہی:

جب انسان اطاعت اور ضبطِ نفس پر کاربند ہو جائے تو اس کے بعد خودی کی تربیت و تکمیل ہو جاتی ہے اور اللہ کے نائب کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ اور اللہ کے نائب کے اوصاف کی جھلک ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ بقولِ اقبال:

---

[7] اقبال، **کلیات اقبال فارسی، اسرار خودی**، 42،42۔

[8] اقبال، **کلیات اقبال فارسی، اسرار خودی**، 43،43۔

نائبِ حق ہمچو جانِ عالَم است ہستئ او ظلِّ اسمِ اعظم است

از رموزِ جزو و کل آگہ بود در جہاں قائم بامر اللہ بود[9]

نائبِ حق حق ہی کی مانند عالم کی جان ہے۔ اس کی ہستی اسمِ اعظم کا سایہ ہے۔ وہ یعنی نائبِ حق جزو و کل سے آگاہ ہوتا ہے۔ اور جہان میں اللہ ہی کے حکم سے قائم رہتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اللہ کا نائب اللہ کی قدرت کی ترسیل کے سبب عزت و احترام پاتا ہے اور خود کو صرف اور صرف اللہ کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ وہ اللہ کی مخلوق کے لیے قابلِ احترام ہو جاتا ہے۔ اور یہی انسان اور انسانیت کی معراج ہے۔

نفس کے حق میں افراط و تفریط اور راہِ اعتدال:

نفس کو پر سکون رکھنا اس کا حق ہے۔ اس کے امور میں افراط و تفریط درست نہیں۔ دینِ اسلام دینِ اعتدال ہے اور اعتدال ہی کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ اقبال نے بھی افراط و تفریط اور اعتدال کے حوالہ سے ایک توجیہ بیان کی ہے جس کے تحت عقل کا بھی مذکور ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

انسان میں بہ حیثیت ایک ہستی فاعل کے حسبِ ذیل قوائے محرکہ ہیں:

1. **عقل یا روحِ ملکوتی:** یہ فہم، امتیاز اور حبِّ علم کا ماخذ ہے۔
2. **روحِ حیوانی:** جو غضب، شجاعت، اقتدار اور بلند ہمتی کا ماخذ ہے۔
3. **روحِ بہیمی:** جو نفس پرستی، اشتہاء اور شہوانی جذبہ کا ماخذ ہے۔

پہلی صورت حکمت کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ دوسری اور تیسری صورتیں اگر ان کو عقل کے قابو میں رکھا جائے تو شجاعت و عفت کی طرف لے جاتی ہیں۔ ان سب کو ہم آہنگی تو افق کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اس کا نتیجہ عدل جیسی فضیلت کی صورت میں بر آمد ہوتا ہے۔[10]

اقبال کی اس توجیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل تو سراپا حکمت ہے جب کہ اگر روحِ حیوانی اور روحِ بہیمی جن کو ضمیر اور نفس کہا جاتا ہے، ان کو عقل کی سرپرستی حاصل ہو جائے تو اس صورت میں نفس نیکیوں کی طرف راغب ہو جائے گا۔ اس صورت میں اعتدال ظاہر ہو گا جو کہ ایک اہم فضیلت ہے اور مقصدِ حیات ہے۔ اس صورت میں اعتدال ایک نیکی کی طرح ہو گا جو کہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ جہان ایک بہترین ممکنہ جہان ہے، اس میں موجود اشیاء بذاتہ بری یا اچھی نہیں بلکہ ان کا غلط یا درست استعمال ان کو برا یا اچھا بناتا ہے۔ نفس اگر اپنی ذات کے اعتبار سے برائی یا اچھائی کی طرف راغب کرے تو دراصل انسان اگر اس پر عمل پیرا ہو گا تو ہی نتیجہ ملے گا جو کہ افراط و تفریط پر مبنی ہو گا، لیکن اگر نفس کی تحریص پر انسان عقل کو راہ نما کرلے تو اس صورت میں اعتدال کی سی فضیلت حاصل ہو گی۔ جس سے نفس مہذب ہوتا ہے۔

اقبال نے عشق کو بھی اعتدال میں رکھ کر ممکنات کے لیے کسوٹی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جو دنیا ہے یہ آدمی میں سما سکتا ہے مگر آدمی وہ ہے جو دنیا میں نہ سمائے۔ آپ جاوید نامہ میں خلافتِ آدم کے تحت رقمطراز ہیں کہ:

از وجودش اعتبارِ ممکنات اعتدالِ او عیارِ ممکنات

آنچہ در آدم بگنجد عالم است آنچہ در عالم نگنجد آدم است![11]

ممکنات کا اعتبار اور اندازہ عشق کے وجود کی بدولت ہے۔ عشق کا اعتدال یعنی راست روی ممکنات کے لیے کسوٹی ہے۔ جہان انسان میں سما جاتا ہے، لیکن انسان جہان میں نہیں سماتا۔

اقبال کہتے ہیں کہ گویا انسان کی بدولت دوسری مخلوقات کی قدر و قیمت ہے۔ اس کے مزاج کے اعتدال پر پوری اترنے والی ہر چیز قابلِ قدر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفس بھی تو ایک مخلوق ہے جو انسان میں ہی ہے اور اگر مزاجِ انسان پر پورا اترے تو انسان عقل کی راہ نمائی لے کر اس کو درست سمت میں رکھ سکتا ہے اور اگر یہ انسان کہ مزاج پر پورا نہ اترے تو ایسی صورت میں انسان کا نفس افراط و تفریط کا شکار ہو جائے گا۔ اور اعتدال باقی نہ رہے گا۔ مزید رقمطراز ہیں کہ جو کچھ خارج میں موجود ہے وہ خود آدمی کے اندر ہے۔ اس لحاظ سے آدمی جہانِ اکبر اور کائنات جہانِ اصغر ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ جہان میں اس طرح رہے کہ جہان کا نہ ہو، نفس جیسے مکار جہان کا باسی نہ بنے بلکہ اس پر نظر رکھے اور اس کو اعتدال میں رکھے۔ اگر اس شعر کی گہرائی کو دیکھا جائے تو یہ اقسامِ نفس میں سے نفسِ امارہ سے نفسِ مطمئنہ کی طرف گامزن کرنے والی فکر ہے۔

---

[9] اقبال، **کلیاتِ اقبال فارسی، اسرارِ خودی**، 44،44۔

[10] اقبال، **فلسفۂ عجم**، ترجمہ: میر حسن الدین، 137۔

[11] اقبال، **کلیاتِ اقبال فارسی، جاوید نامہ**، 656،68۔

خواطرِ نفس کا علاج:

نفس کا لذتوں کی خواہش پیدا کر دینا خطرۂ نفس کہلاتا ہے۔ فکرِ اقبال خودی کے جذبہ سے سرشار ہونا اس کا علاج تفویض کرتی ہے۔ شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے یہ بظاہر خارجی دشمن ہے مگر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ابنِ آدم میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ نفس ایک باطنی دشمن ہے جس کے فریب کی پہچان انتہائی مشکل ہے۔ اقبال بطور علاجِ خطرۂ نفس لکھتے ہیں:

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا   پُر دَم ہے اگر تُو تو نہیں خطرۂ افتاد![12]

اقبال اس شعر میں خودی کو صورتِ فولاد کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ کیوں کہ خودی مستحکم ہو گی تو انسان نفس کے خواطر سے بچ جائے گا۔ اسی لیے وہ کہہ رہے ہیں کہ جیسے شاہین پرواز کی وجہ سے تھک کر نہیں گرتا بعینہ اے تہذیبِ نفس کے طالب شاہین صفت انسان! تو نفس کے خطرۂ افتاد و مصیبت کی وجہ سے پستیوں اور ذلتوں میں نہیں گر سکتا۔ اگر تیرا جذبہ جوان ہے اور اگر تو پُر دَم ہے تو نفس کی باگ کو سنبھال کر اس کے تمام خواطر پر نگاہ رکھ اور اس کے ناجائز مقتضا کو پورا نہ کر۔ فکرِ اقبال سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ انسان خواطرِ نفسانی سے کلی طور پر محفوظ تب ہی رہ سکتا ہے جب ان سے عداوت رکھے۔ چناں چہ رموزِ بے خودی میں رقمطراز ہیں کہ:

روزِ ہیجا لشکرِ اعدا اگر   بر گمانِ صلح گردد بے خطر

تا نگیرد باز کارِ او نظام   تاختن بر کشورش آمد حرام

سرِّ ایں فرمانِ حق دانی کہ چیست؟   زیستن اندر خطرہا زندگیست[13]

جنگ کے دن دشمنوں کا لشکر اگر صلح کے گمان پر بے خطر ہو جائے یعنی اپنے آپ کو خطرے سے دور سمجھنا شروع کر دے تو یہ اُس کی اپنی خام خیالی ہے۔ جب تک اس کا جنگی معاملہ منظم نہ ہو جائے تب تک اس کی سرزمین پر حملہ حرام ہوتا ہے۔ یعنی جب تک دشمن منظم ہو کر اپنی تیاری ظاہر نہ کرے اس وقت تک اس پر حملہ نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا بھید کیا تو جانتا ہے؟ خطرات میں ہی جینا زندگی ہے۔ یعنی خطرات میں ہی زندگی گزارنا دراصل زندگی جینا کہلاتا ہے، ورنہ جو انسان خطرات کے بغیر زندگی گذارتا ہے دراصل وہ صرف زندگی گذار رہا ہوتا ہے زندگی کے اتار چڑھاؤ سے واقف نہیں ہوتا۔

اقبال کے یہ تینوں اشعار تہذیبِ نفس کے ضمن میں اس فکر کو واضح کر رہے ہیں کہ انسان اس وقت تک نفس سے اعلانِ جنگ نہ کرے جب تک کہ نفس انسان پر حملہ آور نہ ہو۔ جیسے ہی نفس حملہ آور ہو اس کی سرکوبی کی جائے۔ یہاں قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ انسان اس صورت میں نفس سے بالکل بے خوف نہ ہو جائے بلکہ اس پر نظر رکھے کیوں کہ خواطرِ نفس سے چھٹکارا ممکن نہیں اس لیے جیسے ہی یہ حملہ کرے جو اس کی فطرت ہے، تو فوراً انسانِ کامل اس کی تہذیب کرنے میں سرگرداں ہو جائے جب تک کہ یہ دوبارہ راہِ راست پر نہ آ جائے۔

حفاظتِ نفس کا اصول:

اقبال کے نزدیک سب کچھ خدا کی ملکیت ہے، لہذا انسان نے امانت کے طور پر اس میں تصرف کرنا ہے، لیکن زمین میں فساد نہ پھیلایا جائے۔ وہ حفاظتِ نفس کے حوالہ سے ابلیسی نظام سے بھی دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ جاوید نامہ میں یوں رقمطراز ہیں کہ:

ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو   چیست شرحِ آیۂ لَا تفسدوا؟

ابن آدم دل بابلیسی نہاد   من بابلیسی ندیدم جز فساد!

کس امانت را بکارِ خود نبرد   اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد

زیرِ گردوں فقر و مسکینی چرا ست؟   آنچہ از مولاست، می گوئی زماست!

بندۂ کز آب و گل بیروں نجست   شیشۂ خود را بسنگِ خود شکست![14]

---

[12] علامہ محمد اقبال، **کلیاتِ اقبال اردو، ضربِ کلیم** (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، مارچ 1982ء)، 72، 534۔

[13] اقبال، **کلیات اقبال فارسی، رموزِ بے خودی**، 127، 127۔

[14] اقبال، **کلیات اقبال فارسی، جاوید نامہ**، 109، 697۔

تو خدا کی زمین کو اپنی زمین کہتا ہے؟ مجھے بتا تو سہی کہ لاتفسدوا والی آیت کی تفسیر کیا ہے؟ ابنِ آدم نے ابلیس کے ساتھ دل لگایا، میں نے ابلیسیت میں بجز فساد کے کچھ نہیں دیکھا۔ کسی شخص نے کسی کی امانت کو اپنی ذات کے لیے استعمال نہیں کیا۔ مبارک ہے وہ شخص جس نے خدا کی ملکیت کو خدا کے سپرد کر دیا۔ آسمان کے نیچے محتاجی اور مسکینی کیوں ہے؟ جو آقا کا ہے، اس کے متعلق تو کہتا ہے کہ وہ میرا ہے؟ وہ بندہ جو اپنے آب و گل یعنی بدن سے باہر نہیں آیا، اس نے اپنا شیشہ یعنی افکار کو پتھر سے توڑ دیا۔

اقبال نے یہاں پر حفاظتِ نفس کا مکمل اصول بتا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کیوں اللہ تعالیٰ کی زمین کو اپنی ملکیت گردانتا ہے اور اس میں ہر خوف سے آزاد ہو کر گناہ کرتا ہے اور اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ حکم تو زمین میں فساد نہ کرنے کا تھا تو پھر یہ زمین میں نفسانی خواہشات کے پیچھے چل کر کس لیے فساد کر رہا ہے۔ اقبال آگے شکوہ کرتے ہیں کہ افسوس ہے کہ ابن آدم نے ابلیس کے ساتھ اپنا دل لگا لیا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے زمین پر فساد پھیلا رہا ہے اور ابلیسی نظام کو تقویت دے رہا ہے۔ کوئی شخص بھی امانت کو اپنے ذاتی استعمال میں اور ذاتی مفاد میں نہیں رکھتا۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ شخص خوش نصیب ہے جو اللہ تعالیٰ کی ملکیت کو اللہ تعالیٰ کی سپرد داری میں رہنے دیتا ہے وہ اپنی جان کی حفاظت کرتا ہے اور نفس کے بہکاوں میں نہیں آتا۔

اقبال نے آسمان کے نیچے اس زمین پر محتاجی کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ جو کچھ اللہ کی ملکیت ہے انسان اسے جانتے بوجھتے اپنی ملکیت سمجھنے لگا ہے اور اس امانت میں جو نفس کی صورت میں انسان میں موجود ہے خیانت کرنے لگا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ انسان جو اپنے بدن میں قید رہا، نفس کے پیچھے چلا یعنی اپنے ہی مفادات کا غلام بن گیا اور مادہ پرستی کی طرف نکل گیا تو گویا اُس نے اپنے ہی پتھر سے اپنے شیشے کو چور چور کر دیا یعنی وہ اپنی تباہی اور بربادی کا خود ذمہ دار ہے۔ لہٰذا اقبال کے نزدیک نفس کی حفاظت اس قدر اہم ہے کہ انسان اگر اس میں خیانت کرے گا تو گویا خود کو ہلاکت میں ڈالے گا۔

متعین نصب اُلعین کا اصول:

اقبال کے نزدیک زیادہ تر لوگ یہ نہیں جانتے کہ ان کا مقصدِ حیات کیا ہے۔ چوں کہ وہ اپنی زندگی کے صحیح اور پائیدار نصب اُلعین سے بخوبی آگاہ نہیں ہوتے اس لیے وہ کامیاب زندگی بسر کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ غیر متعین اور غیر واضح نصب اُلعین کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ اول تو تمہارے دل میں کوئی آرزو پیدا ہی نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی جائے تو فوراً ختم ہو جاتی ہے یا پختگی کی منزل تک نہیں پہنچتی۔ وہ کہتے ہیں:

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں — ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام![15]

مسلمان اپنے مقامات کو بھول چکے ہیں اور اگر کبھی بھولے سے کوئی ایسی آرزو پیدا ہو بھی جائے تو ان کی کاہلی، سستی اور بے عملی کی وجہ سے کچی رہ جاتی ہے اور دم توڑ دیتی ہے۔[16]

اقبال کا کہنا ہے کہ اپنے حصولِ مقصد کے لیے یہ بہت اہم ہے کہ انسان مقصد کا پہلے خاص تعین کر لے اور بعد میں اسے پانے کے لیے ٹھوس لائحۂ عمل بنائے۔ انسان کبھی اپنے نصب العین کو نظر انداز نہ کرے اور اسے حاصل کرنے کا پختہ یقین رکھے اور مقصد کے حصول کے لیے ثابت قدم رہے۔ اقبال نے نصب العین کے حصول کے لیے کچھ اصول بھی معین کیے ہیں:

زندگی را بقا از مدعاست — کاروانش را درا از مدعاست

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

آرزو را در دلِ خود زندہ دار — تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

زندگی سرمایہ دار از آرزوست — عقل از زائیدگانِ بطنِ اوست[17]

زندگی کی بقا کا دارومدار مقصد پر منحصر ہوتا ہے۔ ہنر دانش یعنی مقصد ہی زندگی کے لیے بانگِ درا یعنی قافلے کے رخصت ہونے کی آواز ہے۔ زندگی حقیقتاً جستجو میں پوشیدہ ہے، اس کی اصل یعنی حقیقت آرزو میں پوشیدہ ہے۔ اس سبب سے تُو ہمیشہ آرزو کو اپنے دل میں زندہ رکھ۔ ورنہ تیری ہستی تو قبر کی مٹی کی ایک مٹھی ہے۔ زندگی کا سرمایہ حقیقت میں آرزو ہی ہے۔ اور عقل زندگی کے بطن سے پیدا ہوتی ہے یعنی عقل عمدہ اسی لیے ہے کیوں کہ وہ آرزو کا حاصل ہے۔

---

[15] اقبال، **کلیاتِ اقبال اردو، ارمغانِ حجاز**، 6، 648۔

[16] یوسف مثالی، **شرح کلیاتِ اقبال اردو** (لاہور: عبد اللہ اکیڈمی، 2017ء)، 870۔

[17] اقبال، **کلیاتِ اقبال فارسی، اسرارِ خودی**، 16، 16، 15، 15۔

اقبال کے نزدیک زندگی اس وقت تک جاری و ساری ہے جب تک انسان کی آرزوئیں اور خواہشیں تکمیل کے مراحل میں ہیں۔ان کے نزدیک زندگی دراصل اپنی تلاش میں ہی چھپی ہوئی ہے اور زندگی کی حقیقت آرزو میں پوشیدہ ہے اور چوں کہ آرزوؤں کا زندگی سے گہرا رشتہ ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ ہمیشہ آرزو کو اپنے دل میں زندہ رکھے جس کے تحت اس کی جستجو بھی قائم رہے اور تگ و دو بھی زندگی سے مربوط رہے۔اقبال کے نزدیک اگر متعین نصبُ العین نہ ہو، آرزو نہ ہو تو اس صورت میں انسان کی حیثیت صرف قبر کی مٹی کی ایک مٹھی کی طرح ہو جائے گی۔وہ کہتے ہیں کہ زندگی کا اصل سرمایہ آرزو ہی ہے کیوں کہ آرزو کے بغیر تہذیبِ نفس نہیں ہوتی اور زندگی بے مقصد ہو جاتی ہے،اور اگر زندگی بے مقصد ہو جائے تو اس کی حیثیت نہیں رہتی اور عقل زندگی کے بطن سے جنم لیتی ہے لیکن ہوتی یہ بھی آرزو ہی کا حاصل ہے جس کی وجہ سے یہ اہمیت کا حامل قرار دی جاتی ہے۔

اقبال کے آرزو کے متعلق اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل طریقوں سے آرزو کی روحانی قدر و قیمت ٹھوس شکل اختیار کرلے گی۔

1. انسان اپنے دماغ میں اس متعین اور اصلی نصب العین کو جاگزیں کرلے جسے حاصل کرنے کا خواہاں ہو۔
2. اس بات کا تعین کرلے کہ حصولِ مقصد کے عوض دوسرے انسانوں کو فیض پہنچانا ہے۔
3. ایک واضح تاریخ مقرر کرلے جب اپنا نصب العین پانے کا ارادہ ہو۔
4. اپنی آرزو اور مقصد کو حاصل کرنے کے لیے واضح لائحہ عمل بنائے۔
5. جو لائحہ عمل تشکیل دے، اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے اور یہ یقین رکھے کہ وہ کامیاب ہو رہا ہے۔اس احساس اور یقین کی وجہ یہ ہے کہ آرزو ایسا روحانی چراغ ہے جو انسان کو منزلِ مقصود کا راستہ بتاتی ہے۔اقبال کہتے ہیں:

پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انساں کا ضمیر　　　کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو[18]

اقبال کہتے ہیں کہ جب غلام قوم بیدار ہو جائے اور آزادی کی آرزو لے کر نکل پڑے تو انسان کا دل ہر قسم کے اندازہ و قیاس اور شک سے پاک ہو جاتا ہے اور آرزو کا چراغ ہر راستے کو روشن کر دیتا ہے۔[19]یعنی جب انسان کا ضمیر شک و شبہ سے پاک ہو جاتا ہے تو پھر آرزو کے چراغ سے ہر راہ روشن ہو جایا کرتی ہے۔

یقینِ محکم کا اصول:

اقبال کے نزدیک زندگی میں تہذیبِ نفس کے لیے اپنے موجودہ کام اور اپنی آخری کامیابی میں پختہ یقین رکھنا چاہیے۔جن لوگوں کے دل و دماغ میں مبہم خواہشات اور توقعات ہوتی ہیں وہ کبھی بھی معراجِ ترقی کے حامل نہیں بن سکتے۔بلند مقام پر وہی لوگ فائز ہوتے ہیں جو اپنے مقاصد کے بارے میں واضح تصور اور یقین محکم رکھتے ہیں۔یقین محکم کے حوالہ سے اقبال یوں رقمطراز ہیں کہ:

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی!　　　یقیں اللہ مستی، خود گزینی!
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار　　　غلامی سے بتر ہے بے یقینی![20]

اقبال کہتے ہیں کہ یقین کا حامل ہونا حضرت ابراہیم کی طرح اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا ہے۔یقین کا مطلب احترام ذات اور خدا کی محبت میں مست ہونا ہے۔اے موجودہ تہذیب کے اطوار کے فریفتہ انسان! یقین سے محروم ہونا غلامی سے بدتر ہے۔اقبال یقین کی طاقت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب کسی انسان کے اندر یقین کی صفت ترقی کر جاتی ہے تو اس میں جبریل کے پروں کی مانند قوت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ان کی رائے یہ ہے کہ:

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا　　　تو کرلیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا[21]

[18] اقبال، **کلیات اقبال اردو، ارمغانِ حجاز**، 36، 678۔

[19] یوسف مثالی، **شرح کلیاتِ اقبال اردو**، 909۔

[20] اقبال، **کلیات اقبال اردو، بالِ جبریل**، 81، 373۔

[21] اقبال، **کلیات اقبال اردو، بانگِ درا**، 271، 271۔

پروفیسر یوسف سلیم لکھتے ہیں:

اگر افراد کے دلوں میں یقین (ایمان) کا رنگ موجود ہو تو قوم اگر کسی معرکہ میں ناکام بھی ہو جائے تو دوبارہ کچھ عرصہ کے بعد کامیاب ہو سکتی ہے۔ یہ صفتِ یقین وہ قوت ہے جس کی بدولت کسی قوم کی بگڑی ہوئی تقدیر بن جاتی ہے۔[22]

یعنی جب مٹی کے پتلے میں یعنی انسان میں یقین پیدا ہو جاتا ہے تو یہ حضرت جبریل علیہ السلام کے بال و پر پیدا کر لیتا ہے۔ اقبال یقین کے متعلق مزید کہتے ہیں کہ:

مقام شوق بے صدق و یقیں نیست یقیں بے صحبتِ روح الامیں نیست

گر از صدق و یقیں داری نصیبے قدم بیباک نہ، کس در کمیں نیست![23]

یعنی صداقت اور یقین کے بغیر عشق و محبت کا مقام حاصل نہیں ہوتا۔ جبریل علیہ السلام کی محبت و ہم نشینی کے بغیر یقین میسر نہیں آتا۔ اگر تیرے دل میں سچائی اور یقین ہے تو پھر تو بے خوف ہو کر قدم اٹھا کیوں کہ کوئی شخص تیری گھات میں نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ عشق کا مقام کبھی صدق اور یقین کے بغیر نہیں ہوتا اور نہ ہی صدق و یقین کے بغیر حاصل ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یقین وہ شے ہے جو حضرت جبریل علیہ السلام کی صحبت کے بغیر نہیں مل سکتا۔ اقبال کہتے ہیں کہ خدا جس شخص کے نصیب کو صدق و یقین عطا فرماتا ہے تو اس شخص کو کسی خوف کی مجال نہیں ہوتی کہ وہ اس کے نزدیک بھی پھٹکے۔ اس لیے صاحبِ یقین و صدق بے خوف قدم اٹھاتا ہے۔

عمل و استقلال کا اصول:

تہذیبِ نفس کے لیے عمل اور ثابت قدمی کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ انسان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس بات کو بھی وہ پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا ہے اسے اس کے لیے خاص قسم کا علم ہونا ضروری ہے۔ افکارِ اقبال کی روشنی میں عمل و استقلال کے ذریعے تہذیبِ نفس کا علم اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اُن کے نظریۂ عمل و استقلال میں مہارت کے ساتھ آشنائی ہو۔ عمل و استقلال کے حوالہ سے وہ کہتے ہیں کہ اعمال جنت اور دوزخ کی طرف لے جانے والی زندگی کی تشکیل کرتے ہیں۔ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے نہ تو فرشتہ ہے اور نہ ہی وہ شیطان ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے[24]

انسانی زندگی عمل ہی کی بدولت جنت بنتی ہے اور عمل ہی کی وجہ سے دوزخ بھی۔ حقیقت میں انسان نہ تو نوری ہے نہ ناری۔ یعنی عمل ہی اس کو جنت کا حق دار بناتا ہے اور عمل ہی اس کو دوزخ میں لے جانے کا باعث ہے۔[25] مزید کہتے ہیں کہ معلوم نہیں یہ خدا کو دھوکہ دیتا یا اپنے آپ کو فریب دیتا ہے۔ تقدیر کا بہانہ بنا کر مسلمان بے عمل ہو گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی؟ عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ[26]

اقبال رقمطراز ہیں کہ آزاد انسان کو دنیا میں ہزاروں کام کرنے ہوتے ہیں۔ ایسے انسانوں کے جذبۂ عمل کی بدولت ہی قومیں ترقی کی منزلیں طے کیا کرتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

ہزار کام ہیں مردانِ حُر کو دنیا میں انہیں کے ذوقِ عمل سے ہیں امتوں کے نظام![27]

ان کے نزدیک مضبوط یقین، مسلسل عمل اور محبت کی بنا پر انسان لوگوں کے دلوں کو موہ سکتا ہے۔ یہ تین خوبیاں زندگی کے جہاد میں بلند ہمت انسانوں کے لیے تلوار کا کام دیتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبّت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں[28]

---

[22] یوسف سلیم چشتی، **شرح بانگِ درا** (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، س۔ن)، 536۔

[23] اقبال، **کلیات اقبال فارسی، ارمغانِ حجاز**، 143، 1025۔

[24] اقبال، **کلیات اقبال اردو، بانگِ درا**، 274، 274۔

[25] یوسف مثالی، **شرح کلیاتِ اقبال اردو**، 406۔

[26] اقبال، **کلیات اقبال اردو، ارمغانِ حجاز**، 45، 687۔

[27] اقبال، **کلیات اقبال اردو، ضربِ کلیم**، 159، 621۔

[28] اقبال، **کلیات اقبال اردو، بانگِ درا**، 272، 272۔

اگر ذرے کا دل چیز کر دیکھیں تو اس میں سے سورج کا خون ٹپکے گا۔ زندگی کے جہاد میں مردانِ خدا کی تلواریں کیا کہیں۔ پختہ یقیں، مسلسل جد وجہد اور ایسی محبت جو پوری دنیا کو مسخر کر لے۔[29]

اُن کے نزدیک اگر یقین پختہ ہو جائے اور انسان محنت و استقلال کے ساتھ کام جاری رکھے اور محبت سے جہان کے ساتھ پیش آئے تو اس صورت میں اسے یقیناً کامیابی ملے گی کیوں کہ یہ صفات ایسی ہیں جو مردِ جہد کے لیے تلوار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مسلسل تصورِ مقصد کا اصول:

اقبال کے نزدیک مسلسل تصورِ مقصد کی طاقت پر یقین رکھنا ضروری ہے۔ مسلسل تصور کا مطلب یہ ہے کہ انسان جس شے یا آرزو کو زندگی میں نمایاں دیکھنا چاہتا ہو اس شے یا آرزو کو ہر وقت اپنے باطن کی آنکھ سے دیکھنے کی صلاحیت کا مالک بن جائے۔ انسان کی ذہنی تصویر کی مکمل یاد اتنی ہی حقیقی ہے کہ جتنی انسان کی موجودہ خارجی دنیا۔ اقبال کہتے ہیں:

اے مخاطب! تو اپنی آرزو کو اپنے دل میں زندہ رکھ اور اسے کبھی اپنی نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری مٹھی بھر خاک مزار بن جائے۔[30]

اقبال نے اس اصول کے دو اہم پہلوؤں کی اہمیت پر بھی زور دیا ہے۔ اپنے مقصد کے مسلسل تصور کے ساتھ ان دو پہلوؤں یعنی شیریں گفتگو اور جذبۂ کامرانی کو ملانے سے انسان با آسانی اپنے کام اور پیشے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ان کے نزدیک انسان اپنا مقصد بلند رکھے، دوسروں کے ساتھ نرم اور شیریں گفتگو کرے اور جذبات سے بھرے ہوئے دل کا حامل بن جائے۔ ان تین خصوصیات کو پالینے کے بعد انسان اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ وہ رقمطراز ہیں کہ:

نگہ بلند، سُخن دل نواز، جاں پُرسوز یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے[31]

کسی بھی اعلیٰ نصب العین کو حاصل کرنے کی خاطر اقبال محکم عمل اور میٹھی گفتگو کا فن اختیار کرنے کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے لا الہ کے وارث! اب تجھ میں تیرے اسلاف کی طرح شیریں بیانی اور مضبوط عمل کی صفات باقی نہیں ہیں۔ لکھتے ہیں:

اے لَا اِلٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ![32]

اے لا الہ کے وارث! دنیا کو توحید کا پیغام دینے والے! بے حد افسوس کہ نہ تیری گفتگو میں وہ خودی رہی جو دوسروں کا دل لبھایا کرتی تھی اور نہ ہی تیری سیرت میں جہاد کے جوہر باقی رہے۔[33] اقبال کے نزدیک باعمل اور اولوالعزم انسان اپنی مساعیٔ جمیلہ سے ناممکن کاموں کو بھی ممکن بنا دینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

عمرہا در کعبہ وبت خانہ می نالد حیات تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں[34]

پروفیسر یوسف سلیم چشتی رقمطراز ہیں کہ:

نبی آدم علیہ السلام مدتوں تک اللہ کے حضور میں التجا کرتے رہتے ہیں تب کہیں اللہ اپنے نیک بندوں میں سے کسی کو کارِ تجدید پر مامور فرماتے ہیں۔ یعنی ایسا شخص جو قوم کی زندگی میں انقلاب برپا کر دے، کہیں صدیوں کے بعد جا کر پیدا ہوتا ہے۔[35]

اقبال کہتے ہیں کہ ان اسلامی اصولوں پر عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے زندگی عرصہ دراز تک روتی اور بھٹکتی پھرتی ہے اور جب زندگی ان اسلامی اصولوں پر عمل کرنے کا عشق پیدا کر لیتی ہے تو کائنات کے اصولوں کی راز داں بن جاتی ہے۔

[29] یوسف مثالی، **شرح کلیاتِ اقبال اردو**، 402۔

[30] اقبال، **کلیات اقبال فارسی، اسرارِ خودی**، 16، 16۔

[31] اقبال، **کلیات اقبال اردو، بالِ جبریل**، 49، 341۔

[32] اقبال، **کلیات اقبال اردو، بالِ جبریل**، 54، 346۔

[33] یوسف مثالی، **شرح کلیاتِ اقبال اردو**، 506۔

[34] اقبال، **کلیات اقبال فارسی، زبورِ عجم**، 73، 465۔

[35] یوسف سلیم چشتی، **شرح زبورِ عجم** (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، س۔ن)، 180۔

نفس کی نگہداشت کے طرُق:

اقبال کے نزدیک نفس کی نگہداشت کا تصور وسعت والا ہے۔ اس میں محدود تصور نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آنکھ اسی صورت جہاں بیں ہو سکتی ہے کہ جب اس میں پاک نگاہ ہو۔ نظر کی پاکیزگی سے معاملاتِ نفس ایسی واردات سے محفوظ ہو جاتے ہیں جو نفس کی وجہ سے واقع ہو سکتے ہیں۔ اس لیے نفس کی ہر وقت نگہداشت ضروری ہے، تاکہ انسان اس کی سرکشی کی بدولت بہک نہ سکے۔

اقبال بقولِ آوازِ غیب یہ پیغام پہنچا رہے ہیں کہ:

روشن تو وہ ہوتی ہے، جہاں بیں نہیں ہوتی جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہِ پاک![36]

وہ آنکھ جس کی نظر پاک نہ ہو وہ روشن تو ہوتی ہے یعنی وہ دیکھتی تو ہے لیکن سوجھ بوجھ، پرکھنے اور کھرے کھوٹے کی پہچان کرنے کے قابل نہیں ہوتی یعنی نگاہ کا پاک ہونا ہی حق و باطل میں امتیاز کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور برقرار رکھتا ہے[37]۔

اقبال تہذیبِ نفس کے معاملہ میں کہتے ہیں کہ اگر نگاہ پاک ہو تو اس کی بدولت انسان صرف اپنی ذات کی اونچ نیچ دیکھنے کی حد تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ جہاں بین ہو جاتا ہے۔ اگر انسان من حیث الفرد اور من حیث القوم خود پر نظر رکھیں تو اس صورت میں نفس اور شیطان کی چالوں سے محفوظ ہو جائیں گے اور اگر انسان نے خود پر نظر نہ رکھی تو اس صورت میں شیطان سے بیزاری ہے کیوں کہ نفس سا شیطان وجود میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس لحاظ سے چند طرُقِ نگہداشت ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

مراقبہ سے تہذیبِ نفس:

اقبال کے ہاں دل و نگاہ کی سلامتی ہی اصل مراقبہ ہے جو تہذیبِ نفس میں کارگر ہے۔ بندۂ مؤمن وہی ہے جو دل و نگاہ کا مسلمان ہو۔ چناں چہ اقبال بیان کرتے ہیں کہ:

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خِرد نے کہہ بھی دیا لاَاِلٰہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں[38]

یہ آدمی کا رات کو اٹھ کر عبادت کرنا، مراقبوں میں بیٹھنا اور کیف و سرور میں محو ہونا اگر یہ سب اس کی خودی کی حفاظت نہیں کر سکتے تو بالکل بے کار ہیں۔ یہ عقل جو چاند ستاروں کو شکار کرتی ہے۔ یعنی اس کی پرواز بہت بلند ہے اگر وہ عشق کی چھپی ہوئی لذت کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی تو کس کام کی۔[39]

اقبال کے ان اشعار سے ذکر و اذکار، مراقبہ اور سرور کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اے صوفی تیرے آدھی رات کے وقت ذکر، مراقبے اور کیفیت و سرور سے اگر تہذیبِ نفس نہیں ہوتی تو پھر یہ سب بیکار ہیں۔ اور اگر صاحبِ عقل زبان سے کلمہ توحید کہہ بھی دے تو اس وقت تک کچھ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل سے بھی اس کا اقرار نہ کیا جائے۔ غرض اگر عقل کے ساتھ قلب بھی مسلمان ہو جائے تو انسان کامل ہو جاتا ہے۔ اس کے نفس کی تہذیب ہو جاتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ نفس کے بُت کو توڑ کر اپنی تعمیر کر تاکہ تیری خودی مستحکم ہو سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

سنگ می باش و دریں کارگہِ شیشہ گذر وائے سنگے کہ صنم گشت و بہ مینا نرسید!

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام ھر کہ در ورطۂ لا ماند بہ الا نرسید[40]

پتھر ہو جا اور شیشے کے کارخانے یعنی دنیا سے گزر جا۔ افسوس ہے اس پتھر پر جو بُت تو بنا (یعنی جس نے نفس پروری تو کی) لیکن صراحی بننے کے عمل تک نہ پہنچا۔ پرانے جہان کو توڑ ڈال، اور خراماں خراماں دوبارہ تعمیر کے لیے اُٹھ۔ جو کوئی لا الہ کے بھنور میں چکر کھاتا رہا وہ الا اللہ تک نہ پہنچا۔ یعنی عاشقِ حقیقی بن کر لوگوں کی راہ نمائی نہ کی۔

یوسف سلیم چشتی ان اشعار کے تحت لکھتے ہیں کہ:

---

[36] اقبال، **کلیاتِ اقبال اردو، ارمغانِ حجاز**، 28، 670۔

[37] یوسف مثالی، **شرح کلیاتِ اقبال اردو**، 899۔

[38] اقبال، **کلیاتِ اقبال اردو، ضربِ کلیم**، 35، 497، 34، 496۔

[39] یوسف مثالی، **شرح کلیاتِ اقبال اردو**، 702۔

[40] اقبال، **کلیاتِ اقبال فارسی، زبورِ عجم**، 90، 482۔

اے مخاطب! اگر تو اس دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو پتھر بن کر میدان عمل میں آ، تاکہ جو دشمن تجھ سے متصادم ہوا ہے اسے تیری شدت اور صلابت کا فوراً احساس ہو جائے۔ افسوس ہے اس شخص پر جو زاہد و عابد یا راہب بن کر کسی حجرہ میں بیٹھ جائے اور میدانِ جہاد میں جا کر اپنی خودی کا مظاہرہ نہ کرے۔ دوسرا شعر زبورِ عجم کے بہتر نشتروں میں سے ایک ہے۔ کلمہ طیبہ کے دو جز ہیں لا الہ اور الا اللہ، اس کلمہ کی رو سے مسلمان کو دو کام کرنا پڑتے ہیں:

1. پہلے وہ تمام معبودانِ باطلہ کی نفی کرے یعنی آواز بلند یہ اعلان کرے کہ میری گردن دنیا کے کسی بادشاہ کے سامنے نہیں جھک سکتی۔ کیوں کہ لا الہ کوئی ہستی مجھ پر فرمانروا نہیں ہے۔ اسے تصوف کی اصطلاح میں مقام لا کہتے ہیں۔
2. اس کے بعد وہ بآواز بلند یہ اعلان کرے "لیکن ایک ہستی ضرور ایسی ہے جو مجھ پر فرمانروا ہے اور وہ اللہ ہے" اقبال کہتے ہیں کہ لا میں بڑی طاقت ہے لیکن افسوس کہ آج کوئی لا الہ کہنے والا نظر نہیں آتا۔[41]

اقبال کہنا چاہ رہے ہیں کہ یہ دنیا عارضی ہے، اس کی رنگینی عارضی ہے، افسوس ہے اس پتھر پر جو بُت بن گیا یا اپنے آپ کی پرستش کرتا ہے اور خود پر غور و فکر نہیں کرتا۔ لہٰذا ایسا شخص جو نفس کی بیماریوں میں مبتلا ہو مراقبہ وغیرہ نہ کرے تو وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ دوسرے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ صرف لا الہ نہ کہہ بلکہ الا اللہ کو بھی ساتھ کہہ تاکہ معبودانِ باطلہ سے انکار ہو اور حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو۔ اقبال جاوید نامہ میں بیان کہتے ہیں:

گفت مرگِ عقل؟ گفتم ترکِ فکر　　گفت مرگِ قلب؟ گفتم ترکِ ذکر

گفت تن؟ گفتم کہ زاد از گردِ راہ　　گفت جاں؟ گفتم کہ رمزِ لَآ اِلٰہ

گفت آدم؟ گفتم از اسرارِ اوست　　گفت عالم؟ گفتم او خود روبروست

گفت ایں علم و ہنر؟ گفتم کہ پوست　　گفت حجّت چیست؟ گفتم روے دوست[42]

کہنے لگا عقل کی موت کیا ہے؟ میں نے کہا: فکر کو ترک کر دینا۔ اس نے پوچھا: دل کی موت کیا ہے؟ میں نے کہا: ذکر کو ترک کر دینا۔ اس نے کہا: تن کیا ہے؟ میں نے کہا: راہ کی گرد سے پیدا ہونے والا۔ اس نے کہا: جان کیا ہے؟ میں نے کہا: جان لا الہ کی رمز ہے۔ اس نے کہا: آدمی کیا ہے؟ میں نے کہا: اللہ کے رازوں میں سے ایک راز۔ اس نے کہا: عالم کیا ہے؟ میں نے کہا: وہ جو تیرے روبرو ہے۔ اس نے کہا کہ یہ علم و ہنر کیا ہے؟ میں نے کہا: محض چھلکا ہے۔ اس نے کہا: حجّت یعنی دلیل کیا ہے؟ میں نے کہا دوست کا چہرہ۔

اقبال کا عقل کی موت کو ترکِ فکر قرار دینا، دل کی موت کو ترکِ ذکر قرار دینا، تن کی اصلیت کو راستے کا گرد یعنی مٹی سے بنا ہوا جسم قرار دینا، جان کو رمز لا الہ قرار دینا، آدمی کو اللہ کا راز قرار دینا، جہان کو آنکھوں کے روبرو قرار دینا، علم و ہنر کو محض پردہ قرار دینا اور حجت کو دوست کا چہرہ قرار دینا تمام کا تمام مراقبہ ہے۔ اس بندے کی عقل کی موت ہے جس نے اپنی فکر ترک کر دی۔ اس دل میں باطن زندگی نہیں جو ذکر نہ کرنے کی وجہ سے مُردہ ہے۔ تن، بدن تو مٹی ہے جب کہ جان توحید کا راز ہے۔ آدمی بھی اللہ کا راز ہے۔ جہان سامنے موجود ہے۔ یہ علم و ہنر پردہ کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ جب کہ انسان کا مطلوب وہ دلیل ہے جو دوست تک لے جائے۔ اور دوست تک پہنچنا، عشقِ حقیقی کی راہ میں لگنا یہ تمام مراقبہ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

مجاہدہ سے تہذیبِ نفس:

اقبال نے مجاہدہ کے ذریعے تہذیبِ نفس کو یوں بیان کیا ہے کہ انسان ہر وقت جہد میں لگا رہے۔ اس کی جہد بےکار نہیں ہو گی کہ پرکار کے دائرے کی طرح مُڑ کر وہیں واپس آ جائے۔ اس کا مجاہدہ کرنا اس کی کامیابی کی دلیل ہو گا۔ اسرار خودی میں لکھتے ہیں:

دمبدم نو آفرینی کارِ حُر　　نغمہ پیہم تازہ ریزد تارِ حُر

فطرتش زحمت کشِ تکرار نیست　　جادۂ او حلقۂ پرکار نیست[43]

ہر گھڑی نئی چیز پیدا کرنا آزاد آدمی کا شیوہ ہے۔ ہر دم تازہ نغمے آزاد کے تاروں سے ہی نکلتے ہیں۔ آزاد کی فطرت میں تکرار کی زحمت نہیں ہوتی۔ اس کا راستہ پرکار کا دائرہ نہیں ہوتا۔

---

[41] یوسف سلیم، **شرح زبورِ عجم**، 228، 227۔

[42] اقبال، **کلیات اقبال فارسی، جاوید نامہ**، 37، 625۔

[43] اقبال، **کلیات اقبال فارسی، اسرارِ خودی**، 73، 73۔

یعنی ہر گھڑی نئی چیز، نئی امنگ اور نیا جذبہ پیدا کرنا اور نئی دنیا کے لیے ہمت و جوانمردی سے تگ و دو کرنا آزاد آدمی کا شیوہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر دم تازہ نغمے آزاد آدمی کے تاروں سے ہی نکلتے ہیں۔ آزاد انسان کی فطرت ایسی نہیں ہوتی کہ ایک کام کو بار بار کرنے سے اکتا جائے کیوں کہ وہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔وہ پرکار کے دائرے کی طرح نہیں ہوتا کہ مُڑ کر واپس جہاں سے شروع ہوا تھا وہیں آجائے، بلکہ وہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ محنت و مجاہدہ، صبر و ثبات اس کی طبع کا جزو لاینفک بن جاتے ہیں۔

اقبال مجاہدہ کے حوالہ سے رومی کا شعر ذکر کرتے ہیں جس کا مصرع ہے ع: جہد کن در بیخودی خود را بیاب۔[44]یعنی تو بے خودی کے حصول کے لیے کوشش کر اور یوں خود کو پا لے۔یعنی نفس سے آزادی حاصل کر کے مقامِ بے خودی پر فائض ہو جا اس سے تُو اپنے مقصد یعنی اللہ کی نیابت کو پالے گا اور تیرے نفس کی تہذیب ہو جائے گی۔اقبال کہتے ہیں کہ:

وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار![45]

اقبال کہتے ہیں کہ آج کے دور میں مجھے کوئی ایسا مردِ مجاہد نظر نہیں آتا جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار ہو یعنی ایسا مجاہد جو سراپا جہد و عمل ہو، آج مفقود ہے۔[46]جس کا کردار آئینے کی طرح صاف ہو۔جو نفس کے رزائل سے محفوظ ہو۔اگر کوئی ایسا ہو تو وہ مردِ مجاہد تسلیم و رضا کا پیکر مومن ہو گا کیوں کہ:رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن![47]یعنی نفس چوں کہ باطل کی طرف لے جاتا ہے اور عقل حق کی طرف لے جانے والی ہے اس لیے جب بھی حق اور باطل، بالفاظِ دیگر عقل اور نفس کا آپس میں سامنا ہو جائے تو مؤمن فولادی کردار کا مالک بن جاتا ہے اور حق کا ساتھ دیتا ہے۔اور یہ اٹل قانون ہے کہ حق ہمیشہ غالب آتا ہے۔لہذا مجاہدہ کرنے والے انسان کے نفس کی سرکشی جاتی رہتی ہے اور نفس کی تہذیب ہو جاتی ہے۔

بحث و تجزیہ

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کلام فکرِ انسانی کو پستیوں سے نکالنے اور بلندیوں پر لے جانے کا سبب جانا جاتا ہے۔آپ کے کلام میں تہذیبِ نفس کے حوالہ سے بھی افکار موجود ہیں۔آپ نے متعلقاتِ تہذیبِ نفس کے حوالہ سے بھی کلام کیا ہے۔آپ کے نزدیک ہستی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج طے کرنا انسان کا نصب العین ہے۔آپ نے اس ضمن میں اطاعتِ قانونِ الٰہی، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی جیسے مراحل کا ذکر کیا ہے۔آپ کے نزدیک نفسِ انسانی ایک شہوانی جذبہ ہے جسے عقل کے ذریعے اعتدال میں لایا جاسکتا ہے۔اس سے انسان افراط و تفریط سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

اقبال نے تہذیبِ نفس کے متعلقات میں سے خطراتِ نفس سے بچنے کی تعلیم دی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ انسان اگر پُردم ہو تو مصائب سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔انہوں نے دنیا کی دوستی اور طلب کو متاعِ غرور کے سودے سے تشبیہ دی ہے اور اس سے بچنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ بیان کیا ہے کہ جیسے وہ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کے ہو کر نہیں رہے ایسے ہی اُن کے امتی کو چاہیے کہ دنیا کی دوستی سے خود کو بچائے۔ اُن کے افکار میں یہ بھی موجود ہے کہ انسان کی نگاہ اگر پاک نہ ہو تو وہ حق و باطل میں امتیاز نہیں کر سکتا۔اگر حق و باطل میں امتیاز کرنے سے انسان عاجز آجائے تو سمجھا جائے گا کہ گویا وہ نفسانی خواہشات کی پیروی کر رہا ہے جس سے اسے بچنا چاہیے۔

اُن کے کلام میں حفاظتِ نفس کے حوالہ سے بھی افکار موجود ہیں جن میں وہ کہتے ہیں کہ وہی انسان خوش نصیب ہے جس نے ابلیسیت کی بجائے خود کو خدا کی ملکیت کے سپرد کر دیا۔کیوں کہ جس نے خود کو خدا کی ملکیت کے سپرد کر دیا وہ اپنی جان کی حفاظت کرتا ہے اور نفس کے بہکاوں میں نہیں آتا۔انہوں نے متعین نصبُ العین کو اپنانے کی بھی ترغیب دی ہے۔ان کے نزدیک انسان کے لیے یہ جاننا از حد ضروری ہے کہ اس کا مقصدِ تخلیق کیا ہے؟اس ضمن میں وہ آرزو کے چراغ کو تھامنے کی تلقین بھی کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے مقامات کو نہ بھولے اور اپنے خاص مقصد کا تعین کرلے تا کہ اس کے نفس کی تہذیب ہو سکے۔

انہوں نے یقینِ محکم کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اگر انسان میں یقین کی آگ روشن ہو تو وہ ہر قسم کے معرکہ میں خواہ وہ نفس سے ہی کیوں نہ ہو فتح یاب ہو سکتا ہے۔پھر انہوں نے عمل و استقلال کا اصول بھی بیان کیا ہے۔اس کے تحت کہتے ہیں کہ انسان کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا عمل کیا ہے۔وہ نفس کی پیروی میں لگا ہوا ہے کہ شریعت کی پیروی میں۔انسان عمل ہی کے ذریعے جنت اور جہنم کی راہوں میں سے کوئی راہ اختیار کرتا ہے۔اس ضمن میں وہ تہذیبِ نفس کے لیے مسلسل تصورِ مقصد کا اصول بیان کرتے ہوئے

---

[44]اقبال، **کلیاتِ اقبال فارسی، رموزِ بیخودی**، 80،80۔

[45]اقبال، **کلیاتِ اقبال اردو، ضربِ کلیم**، 40،502۔

[46]حمید اللہ شاہ ہاشمی، **شرح ضربِ کلیم** (جہلم: بک کارنر شوروم، 2017ء)، 66۔

[47]اقبال، **کلیاتِ اقبال اردو، ضربِ کلیم**، 45،507۔

کہتے ہیں کہ انسان جس شے یا آرزو کو زندگی میں نمایاں دیکھنا چاہتا ہو وہ اُس شے کو باطن کی نگاہ سے دیکھنے کا مالک بننے کی کوشش کرے اور خود میں گفتارِ دلبرانہ اور کردارِ قاہرانہ پیدا کرے۔ نفس سے نگہداشت کا راستہ اقبال نے مشارطہ اور مجاہدہ کی صورت میں بیان کیا ہے۔ ان کے ذریعے نفس کی تہذیب کی جا سکتی ہے۔

نتائج:

- علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نفس اونٹ کی طرح خود پرور، خود سوار اور خود سر ہے۔ اس کی لگام کو تھامنے سے ہی اس کی تہذیب ممکن ہے۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں ہستی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج طے کرنا انسان کا نصبُ العین ہے نیز تہذیبِ نفس کے لیے انسان کو اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی جیسے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔
- اقبال کے افکار میں تہذیبِ نفس کے لیے نفس کو اعتدال میں رکھنا بھی ضروری ہے۔ اُن کے نزدیک اسی انسان کے نفس کی تہذیب ہو سکتی ہے جس نے ابلیست سے چھٹکارا پایا اور خود کو خدا کی ملکیت کے سپرد کر دیا اور تہذیبِ نفس کے اصولوں اور طُرق کو اپنا شعار بنایا۔
- اُن کے افکار میں خواطرِ نفس کا علاج، حفاظتِ نفس کا اصول، متعین نصبُ العین کا اصول، یقینِ محکم کا اصول، عمل و استقلال کا اصول اور مسلسل تصورِ مقصد کا اصول قابلِ ذکر ہیں۔
- اُن کے کلام میں نفس کی نگہداشت کے طُرق کا پتا چلتا ہے جن میں مشارطہ سے تہذیبِ نفس، مراقبہ سے تہذیبِ نفس اور مجاہدہ سے تہذیبِ نفس قابلِ ذکر ہیں۔

سفارشات:

- تہذیبِ نفس پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نظریۂ عقل کا جائزہ لیا جائے۔
- علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ تعمیری افکار کے نفس پر اثرات کو بیان کیا جائے۔
- علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں بیان کردہ تہذیبِ نفس کے اصولوں کا عصری تناظر میں تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جائے۔